''دل بھٹکے گا'' ناول یا آپ بیتی

ڈاکٹر خالد محمود سنجرانی، شعبۂ اُردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور

Abstract

A few arguments were put forwarded regarding the Novel "Dil Bhatay Ga" by Ahmad Bashir" that whether it is a Novel or an auto biography? This article presents strong arguments to both prespectives and also such points are figured out that lead to the emergence of this confusion. The article concludes that may be in near future such novels become a cause for emergence of a new novel writing style.

بڑے قد کے تخلیقی فنکار فن کے مروّجہ پیمانوں کے پابند نہیں ہوا کرتے اور نہ ہی درسی اکتساب کے مرہونِ منت۔ ہر عہد کا بڑا فنکار اپنے لیے فنون کے ضابطے اور سانچے خود ڈھالتا ہے۔ تخلیق کار کی اس خاص اُفتاد کے علاوہ ایک اور اہم بات یہ ہے کہ ہر صنفِ ادب کے شناختی نشانات زیادہ عرصہ ایک ہی ڈگر پر نہیں رہتے۔ ان میں تبدیلی کا عمل اگر ممکن نہ بھی رہے تو نئے عہد کی دستک ازخود ایک نئے دریچے کو وا کر دیتی ہے۔ اردو ناول میں لگے بندھے اُصول مدت مدید تک جاری رہے۔ قدیم ناول کے ہیئتی، فکری اور فنی مبادیات کو ممتاز مفتی کے ''علی پور کا ایلی'' نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ تب اس بات پر خاصی لے دے بھی ہوئی کہ مفتی کے ناول اپنے فنی حوالوں سے آپ بیتی سے قریب تر ہیں۔ جب مفتی نے بھی اعتراف کر لیا کہ یہ ناول ان کی آپ بیتی ہے اور ناول کے آخری صفحات میں کرداروں اور مقامات کے اصل نام تک درج کر دیئے گئے تو فنون کے عہدِ زریں کے پر جوش حامیوں کی تحریروں میں طمانیت کا اظہار ہونے لگا اور ''فاعلاتن فاعلات'' کی گردان کرنے والوں نے مفتی کے نالوں کو فنِ ناول نگاری کے دائرے سے خارج کر دیا۔ دراصل، یہ ناول کی ہیئت اور تکنیک کی وہ ابتدائی کروٹ ہے کہ جس کی شکنیں احمد بشیر کے نئے ناول ''دل بھٹکے گا'' پر دکھائی دیتی ہے۔

فنی اعتبار سے جو چیز ناول کو آپ بیتی کے مسلمہ فن سے ممتاز کرتی ہے، وہ غیر شخصی انداز ہے۔ بڑا تخلیق کار اپنے ذاتی حالات وواقعات اور مشاہدات کو پیرتا ہوا وہاں جا کر دم لیتا ہے کہ جہاں شخصی حوالے ازل وابد کی حیرتوں اور مجموعی لاشعور میں جا کر ضم ہو جاتے ہیں۔ پھر کوئی ایک بھی حوالہ ذاتی نوعیت کا نہیں رہتا۔ تخلیق کار کا یہی ہنر ہے کہ وہ ان وسائل کو بروئے کار لاتا ہے کہ جن کے سبب تخلیق سے ذاتی چھاپ دور ہو سکے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہر تخلیق ''آپ بیتی'' کی بنیاد ہی پر استوار کی جاتی ہے۔ یہ آپ بیتی خارجی عوامل پر مبنی ہو یا خاصے گہرے داخلی محسوسات پر۔ تخلیق کار کا کام اپنے مشاہدات اور تجربات کو غیر شخصی

انداز میں سامنے لانا ہے۔ اس حوالے سے فرائیڈ نے کہا:

"A man who is a true artist has more at his disposal. In the first place, he understands how to work... in such a way as to make them lose what is too personal..."[۱]

دیکھنا یہ ہے کہ احمد بشیر نے ''دل بھٹکے گا'' میں اپنے خالصتاً ذاتی حوالوں کو کس حد تک اجتماعی اور فنی سانچوں میں ڈھالا ہے۔ مثال کے طور پر انہوں نے اپنے لئے جمال کا نام برتا ہے۔ اگر یہی معاملہ وہ دیگر اشخاص کے باب میں برتتے تو یہ عمل زیادہ موثر ثابت ہوتا۔ انہوں نے ممتاز مفتی، حسرت موہانی، چراغ حسن حسرت اور حفیظ جالندھری کا تذکرہ اصل نام کے ساتھ کیا ہے۔ اس نوع کی دیگر مثالیں بھی کتاب میں موجود ہیں۔ کرداروں کی پیش کش کا یہ انداز آپ بیتی کا تاثر لیے ہوئے ہے۔ مقامات کا ذکر کرتے ہوئے احمد بشیر نے چند مقامات کے فرضی نام استعمال کیے بہت سوں کو اصل نام کے ساتھ درج کیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ناول اگر تبدیلی قالب کا تقاضا بھی کرے تو تب بھی اصل ناموں کی گنجائش اس میں اس لیے نہیں نکلتی کہ ذاتی اور شخصی حوالے تخلیقی جہت کو نمایاں ہونے میں معاونت نہیں کرتے۔ منٹو نے ''ترقی پسند'' میں جبکہ بیدی نے ''نئے دیوتا'' میں ایک دوسرے کا خوب خاکہ اڑایا ہے۔ انہی شخصی حوالوں کے سبب یہ دونوں افسانے جست بھر کر منٹو اور بیدی کے عمدہ افسانوں کی قطار میں شامل نہ ہو سکے۔ ابوسعید قریشی نے ''منٹو'' میں سوگندھی کا تعین کیا، ''کالی شلوار'' کی سلطانہ کا سراغ لگایا لیکن اس انکشاف کے باوجود یہ دونوں افسانے اپنا تخلیقی لطف قائم رکھے ہوئے ہیں کہ منٹو نے اُن شخصی کوائف کو انسانی رویوں سے جا ملایا۔ احمد بشیر کے ہاں کرداروں کے اصل نام اگرچہ شخصیات کے رجحانات فراہم کرتے ہیں اور نہایت عمدہ انداز میں چلتی پھرتی تصویریں دکھاتے ہیں لیکن ناول کی تخلیقی فضا میں قدرے کھٹکتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

احمد بشیر کی اس سے پہلے ''جو ملے تھے راستے میں'' نہایت عمدہ کتاب ہے۔ خاکہ نگاری کی روایت میں ''جو ملے تھے راستے میں'' میرے نزدیک تو کلاسیک کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی سے احمد بشیر کی آپ بیتی کے الجھے سلجھے اور بکھرے ہوئے نقوش سامنے آتے ہیں۔ احمد بشیر کا تفصیلی تذکرہ ''علی پور کا ایلی'' بالخصوص ''الکھ نگری'' میں موجود ہے۔ مذکورہ تینوں کتب میں احمد بشیر کے نقوش ایک بڑے پیمانے پر ''دل بھٹکے گا'' میں موجود ہیں۔ ''الکھ نگری'' کے احمد بشیر اور ''دل بھٹکے گا'' کے احمد بشیر میں نمایاں تفاوت دیکھنے کو ملتا ہے۔ اب معلوم نہیں کہ ڈنڈی مفتی نے ماری ہے یا خود احمد بشیر نے۔ ''الکھ نگری'' میں احمد بشیر ایمن آباد کے ریلوے اسٹیشن پر ہندوؤں کی گاڑی کو بھرپور جذبے کے ساتھ کاٹتا ہوا نظر آتا ہے اور اس مقصد کے لیے مفتی کو نہ صرف لاہور سے ساتھ لے جاتا ہے بلکہ اسے اکساتا بھی ہے جبکہ ''دل بھٹکے گا'' کا احمد بشیر بہتا ہوا خون نہیں دیکھ سکتا:

''حکم آیا کہ سورج نکلتے ہی گاڑی پر حملہ کر دیا جائے کہ جو رہ گیا سو رہ گیا۔''

ڈونڈی کی آواز سن کر جمال کا دل بیٹھ گیا۔ مشتاق نے کہا ''چلو ہم بھی چلتے ہیں۔ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔''

جمال نے کہا: ''چھوڑو۔ بے گناہ لوگ قتل ہوں گے۔ بہتا خون ہم سے نہ دیکھا جائے گا۔''[۲]

اُردو شاعری نے تو فسادات کا منظر نامہ پیش نہ کیا البتہ یہ بار افسانوی ادب میں اٹھانے کی تڑپ موجود تھی، اس لیے اردو کا افسانوی ادب فسادات کا بوجھ اٹھا گیا۔ اردو کے قاری کے لیے فسادات کوئی نیا موضوع نہیں ہے لیکن ''دل بھٹکے گا'' میں جہاں جہاں اس کا ذکر آیا ہے، وہ انسان کے رونگٹے کھڑے کر دینے کے لیے کافی ہے۔ ''دل بھٹکے گا'' میں فسادات کا حصہ پڑھتے

ہوئے اب بھی انسانیت کا سر کرب آمیز شرم سے جھک جاتا ہے۔

''دل بھٹکے گا'' کی وساطت سے مغربی پنجاب کے فسادات کا تفصیلی منظر نامہ اردو ادب میں شاید پہلی بار اتنے موثر انداز میں ہوا ہے۔ اگرچہ ممتاز مفتی نے بھی ''الکھ نگری'' کرشن نگر کے حالات بیان کیے تھے مگر احمد بشیر نے شاہ عالم، کرشن نگر اور ایمن آباد میں ہونے والے فسادات اس انداز سے بیان کیے ہیں کہ سرحد کے اِس پار ہونے والے ظلم کو اپنی ذات اور قوم کے سر لینے کا حوصلہ دکھائی دیتا ہے۔

''دل بھٹکے گا'' میں مسلمان عورتوں کی رحم دلی اور جذبۂ انسانیت کی جو تصویر پیش کی گئی ہے، وہ نہ صرف قابل فخر ہے بلکہ انسانیت کی مشترکہ میراث کو بھی سامنے لاتی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

> ''صبح سویرے ہی سب کو پتہ چل گیا کہ نور پور کے پگ بندھ جوان رات بھر عورتوں اور بچوں کو کٹی ہوئی گاڑی سے اٹھا کر نور پور لاتے رہے ہیں۔ قاتلوں کی ماؤں بہنوں نے انہیں فوراً حفاظت میں لے لیا اور اپنے قاتلوں کو گھر سے نکال دیا۔ اب وہ ہر مرد کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی تھیں۔''
>
> ماسی اقبال نے اپنے سفید ریش میاں کی بہت بے عزتی کی، حالانکہ وہ تو مسجد سے نکلا بھی نہ تھا۔ اپنے دیور کو اس نے جوتیاں مار کر گھر سے نکال دیا جو بملا کو اٹھا کر لایا تھا۔ ماسی اقبال بملا کو سینے سے لگا کر بے تحاشا روئی پھر اس نے اپنے خاوند کی صورت پر تھوک دیا۔ مشتاق نے کہا: ''ماسی تم بملا کو میرے حوالے کر دو تم پر بوجھ ہو گی۔'' وہ بولی: ''میں اس کی خدمت خود کروں گی۔ اسے روٹی دوں گی چاہے میرے بچے بھوکے رہیں۔ وہ اللہ کی امانت ہے۔ تھوڑی دیر بعد چادر میں لپٹی بملا جب ماسی اقبال کے گھر سے نکلی تو گلی میں کہرام مچ گیا۔ ایک ایک عورت اسے گلے لگانے اور سینے سے چمٹانے لگی۔ آہ وزاری نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ ماسی اقبال پچھاڑیں کھا کھا کر گرنے اور زمین پر لوٹنے لگی۔ دھاڑیں مارتے اور دعائیں دیتے ہوئے اس کا گلا خشک ہو گیا۔ معافیاں مانگتے ہوئے عورتوں کی زبانیں خشک ہو گئیں۔''[۳]

مغربی پنجاب میں مسلمانوں کے ہاتھوں ہونے والے مظالم پر مسلمان عورتوں کے شدید ردِ عمل کی مذکورہ مثال جیسی کئی مثالیں ''دل بھٹکے گا'' میں موجود ہیں تو ایک لمحے کے لیے ہی سہی، انسانیت کے کھوئے ہوئے شرف و وقار کی بازیافت کرتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ بیدی کے ''لاجونتی'' میں سندر لال بابو کے بعد ''دل بھٹکے گا'' کی مسلمان عورتیں وحشت اور خونی دور میں ناقابل یقین ہمدردی، خلوص اور مہر و وفا کی دوسری بڑی مثال بن کر سامنے آتی ہیں۔

''دل بھٹکے گا'' میں فسادات کا حصہ کئی اعتبار سے نئے پن کو سامنے لاتا ہے اور ''آپ بیتی'' کا گمان نہیں گزرتا۔ آگے چل کر جب ''دل بھٹکے گا'' میں صحافتی زندگی اور ملک کے سیاسی نشیب و فراز سامنے آتے ہیں تو یہاں تخلیقی سرا احمد بشیر کے ہاتھ سے نکلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ احمد بشیر نے ''دل بھٹکے گا'' میں فسادات کے حصے کے علاوہ دیگر مقامات پر اپنی کتھا بیان کی ہے اور جس کا انداز ناول کی تخلیقی جہت سے مماثل محسوس نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے ''دل بھٹکے گا'' کو ناول کے طور پر دیکھنے میں قدرے دشواری کا سامنا ہوتا ہے۔

ممتاز مفتی کے دونوں ناولوں اور احمد بشیر کے ''دل بھٹکے گا'' میں فنی اور تخلیقی اعتبار سے نمایاں فرق یہ ہے کہ مفتی کے

دونوں ناول احساس محرومی، توجہ طلبی، عقل و عشق کی معرکہ آرائی اور حسرتوں کو جاری و ساری رکھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ مفتی کے دنوں ناول فرد کی باطنی کش مکش اور پیاس کو پوری زندگی پر بکھیرتے نظر آتے ہیں۔ ان ناولوں میں یہی قدر اور انداز بکھرے ہوئے نقوش کو یک جا رکھنے میں مدد دیتا ہے۔ احمد بشیر کے ''دل بھٹکے گا'' میں ایسی مثال نہیں آتی۔ یہ کتاب مختلف ٹکڑوں میں منقسم ہے اور یہ ٹکڑے کسی بھی مقام پر جا کر کوئی ایک بڑی تصویر بنانے میں ناکام نظر آتے ہیں۔ یہی عنصر ''دل بھٹکے گا'' کو ناول کی نئی صورت بھی دینے میں کامیاب محسوس نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود اس کتاب کا ہر ذرّہ اپنی جگہ پر آفتاب سے کم نہیں۔ ''ناول لکھنے کی ترکیب'' کے عنوان سے احمد بشیر لکھتے ہیں:

> ''میرے پاس کوئی چکر دار پلاٹ نہیں۔ میرے کردار بھی میرے ساتھ دور تک نہیں چلتے۔ ادھر میں نے آنکھ جھپکی ادھر وہ گلیاروں میں گم ہو گئے، مگر کیا زندگی میں ایسا ہی نہیں ہوتا؟ کس نے زندگی پلاٹ کے مطابق گزاری۔''[۴]

ہمارا خیال ہے کہ احمد بشیر کے کردار گلیاروں میں گم نہیں ہوئے۔ اس کا ثبوت ''دل بھٹکے گا'' سے بہتر کیا ہوگا۔ ساتھ رہنے والے کردار تو صرف اس لمحے گم ہوتے ہیں، جب انسان خود گم ہو جاتا ہے۔ اگرچہ ''دل بھٹکے گا'' کو ذہن فوری طور پر ناول کی حیثیت سے قبول کر لینے سے گریزاں ہے مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ناول نگاری کے نئے اسالیب، سانچے اور انداز ''دل بھٹکے گا'' کی صورت میں ہمارے دروازے پر دستک دے رہے ہوں۔ دروازے کی یہ زنجیر اب وقت ہی کھولے گا۔

حوالہ جات:

۱۔ Freud, Sigmund: "Introductory Lecturer on Psychoanalysis" (Vol. 1), edited by James Strachey, Pengiun Books, London, 1995, p. 423

۲۔ احمد بشیر، ''دل بھٹکے گا''، لاہور: فیروز سنز، ۲۰۰۳ء، ص: ۳۳۳

۳۔ ایضاً، ص: ۴۴۔۳۴۳، ۳۵۵

۴۔ ایضاً، ص: ۸

II